ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

قرآن کا اسلوبِ بیان
اور
اس کی معجزانہ شان

تمہید:

قرآن کریم، خالقِ کائنات اور پروردگارِ عالم کی آخری کتاب ہے جسے اس نے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا اور جس کے ذریعے رسالت ونبوت کا خاتمہ فرمایا۔

قرآن کریم خلق کی صلاح وفلاح کے لیے خالق جل مجدہ کا دستور ہے، اہل زمین کے لیے آسمانی ہدایت ہے۔ پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا زندۂ وجاوداں معجزہ ہے جو صبح قیامت تک ان کی نبوت ورُسالت اور صداقت وامانت کا اعلان کرتا رہے گا۔

قرآن کریم، اسلامی عقائد واعمال، عبادات واخلاق، احکام ومواعظ اور علوم ومعارف کا منبع ومخزن ہے جس کے بغیر اسلامی زندگی کا تصور نہیں ہے۔

قرآن کریم وہ انقلاب آفریں کتاب ہے جس نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، جس کی انقلاب آفرینی سے انسانی تاریخ وسماج اور جغرافیا سبھی متاثر ہوئے۔ جس نے ظلمت وذلت کی تنگنائیوں میں بھٹکنے والی انسانیت کو عزت وعظمت کی روشن شاہراہ سے روشناس کیا۔

قرآن کریم عربی زبان کی بقا اور سلامتی کا باعث اور اس کے تمام علوم وفنون کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ابتدائے اسلام سے ہی اس کتاب کو اپنے فکر ونظر کا محور بنایا۔ اسی کی فہم وتفہیم کے لیے عربی زبان کے اصول وقواعد کو مرتب کیا گیا اور نحو وصرف، لغت وبلاغت وغیرہ فنون کی تدوین عمل میں آئی۔ علاوہ ازیں علوم قرآن کے

بھی مختلف شعبے وجود میں آئے ان میں ایک اہم شعبہ علم اعجاز القرآن کا بھی ہے۔ عربی زبان میں اعجاز کا معنی : عاجز و درماندہ کرنا ہے، لہٰذا اعجاز القرآن کا معنی ہے کہ : "إعجاز القرآن الخلقَ عن الإتیان بماتحداهم به" یعنی قرآن کا تمام مخلوق کو اپنی مثال لانے سے عاجز کر دینا ہے۔ لیکن یہ عاجز کرنا بذات خود اس کا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصود لازم معنی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور جو رسول اسے لائے ہیں وہ برحق ہیں۔ اور اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو دوسرا انسان بھی اس کی مثال لانے پر ضرور قادر ہوتا۔

قرآن کا اعجازِ بیان اس قدر واضح اور اس کی معجزانہ شان اتنی ظاہر و باہر ہے کہ اہل عرب نے ابتداء ہی میں اس امر کا احساس وادراک کر لیا کہ اس کلام میں وہ قوت وتاثیر ہے جو کسی انسان کے کلام میں ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ لوگ اسے سننے نہ پائیں۔ حج کے زمانے میں مشرکین مکہ راستوں میں گھات لگا کر بیٹھتے تھے اور ہر آنے والے کو یہ تاکید کرتے تھے کہ ابن عبداللہ کی بات ہرگز نہ سننا ان کی گفتگو ایسا جادو ہے جو انسان اور اس کے گھر والوں میں جدائی ڈال دیتا ہے۔ بعض اہل بلاغت کا یہ کہنا کہ تمام عرب اعجاز قرآن کے ادراک وشعور میں یکساں نہیں تھے اور قرآن کا اعجاز صرف انھیں کے لیے حجت و دلیل تھا جو اہل فصاحت و بلاغت میں سے تھے۔ صاحب ''اعجاز القرآن'' ابوبکر باقلانی متوفی ۳۰۴ھ/ ۹۱۷ء کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کے بقول اگر تمام عرب فصاحت میں ایک مرتبہ پر ہوتے تو سب کے سب بیک وقت مشرف بہ اسلام ہو جاتے چنانچہ انھوں نے بعض مشرکین کے ایمان نہ لانے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ ان پر قرآن کا اعجاز واضح نہیں تھا ''اس معاملے میں ایک عرب اہل زبان جو زبان کے اس مرتبے پر نہ ہو اور ایک عجمی دونوں برابر ہیں'' حقیقت یہ ہے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ نزول قرآن کے وقت تمام اہل عرب فصحاء تھے۔ فصاحت میں ان کا باہمی تفاوت مسلم ہے لیکن کوئی اس درجے پر نہیں تھا کہ اسے عجمیوں کے زمرے میں رکھا جائے اور رہا بعض کا اسلام نہ لانا تو اس سے اعجاز قرآن کے غیر واضح ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اس کے لیے دوسرے معروف اسباب ہیں جن کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ آخر تک ایمان نہ لانے والوں میں قریش

اورعرب کی بہت سی ایسی شخصیات ہیں جن کی فصاحت و بلاغت ہر شک وشبہ سے بالا ہے ۔علاوہ ازیں قریش ہر خاص وعام کوقرآن سننے سے روکتے تھے نہ صرف اہل بلاغت اور شعراء وخطباء کو، گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہر عربی اپنی زبان کا اس قدر سلیقہ ضرور رکھتا ہے کہ وہ قرآن کے اعجاز کو جان سکے۔

عقبہ اولی میں خزرج کے وفد نے صرف چند آیات سنکر اسلام قبول کرلیا اور اسی وفد کے ارکان کے ذریعے تھوڑے ہی عرصے میں انصار یثرب کے گھر گھر میں قرآن اور اسلام پہنچ گیا، اسی لیے کہا گیا ہے کہ: دوسرے علاقے شمشیر وسنان کے ذریعے فتح ہوئے اور مدینہ آیات قرآن کے ذریعے فتح ہوا۔''

قرآن کریم کے بیانی اعجاز کی تاثیرات کے بے شمار واقعات کتب احادیث وسیر میں مذکور ہیں اور متأثرین میں سماج کے ہر طبقے کے لوگ ملتے ہیں۔قرآن کے شدید مخالفین بھی اس کی سحر آفرینی سے خود کو بچا نہیں سکے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔

حدیث بیعت عقبہ میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت مصعب ابن عمیر کو مدینے میں تبلیغ اسلام پر مأمور فرمایا۔ایک دن وہ حضرت اسعد بن زرارہ کے ہمراہ قبیلۂ بنی عبدالأشہل کی طرف نکلے جب قبیلے کے سردار سعد بن معاذ کو ان دونوں حضرات کی آمد کی خبر ملی تو انھوں نے اسید بن حضیر سے کہا کہ: جاؤ ان دونوں کو ڈانٹ کر واپس کردو، میں خود یہ کام کرتا لیکن تم جانتے ہو کہ اسعد میرے ماموں زاد بھائی ہیں اور میں ان سے کچھ (سخت بات) کہنا نہیں چاہتا۔چنانچہ اسید بن حضیر ان کے پاس پہنچے اور انھیں دھمکی دی کہ اگر خیر چاہتے ہو تو فوراً واپس چلے جاؤ۔حضرت مصعب نے ان سے کہا کہ تھوڑی دیر میری بات سن لیجئے اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا آپ کو اختیار ہے اور پھر حضرت مصعب نے قرآن کی تلاوت شروع کردی اسید بن حضیر نے اپنے نیزے کو زمین پر گاڑا اور اسی سے ٹیک لگا کر سننے لگے، ذرا ہی دیر میں ظلمت کے سارے حجاب تار تار ہو گئے اور اسلام کی نورانیت نے ان کے دل ونگاہ کو منور کردیا، پھر حضرت اسید، سعد بن معاذ کو بھی ان کے پاس لے گئے ابتداء میں انھوں نے سخت کلامی کی لیکن محض چند آیات قرآنی سنکر اسلام لے آئے۔پھر حضرت سعد اپنے قبیلے والوں کے پاس

آئے اور کہا کہ: میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ لوگوں نے بیک زبان کہا کہ: آپ ہمارے سردار اور ہم سب سے زیادہ عقل مند اور صائب الرائے ہیں۔ حضرت سعد نے ان پر اسلام پیش کیا اور شام ہوتے ہوئے پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

حضرت جبیر بن مطعم ایک مشرک کا فدیہ ادا کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ طور کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر پہنچے: "إن عذاب ربك لواقع ماله من دافع" (الطّور: ۷.۸)۔ بیشک آپ کے رب کا عذاب ضرور پیش آنے والا ہے جسے کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ تو ان پر ایسی رقت وخشیت طاری ہوئی کہ فوراً اسلام قبول کر لیا اور کہنے لگے کہ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں مجھ پر اسی وقت عذاب نہ نازل ہو جائے۔

قرآن کریم کی سحر بیانی کا یہ عالم تھا کہ اسلام کے بدترین مخالفین اور قریش کے سرداروں میں سے بہت سے ایسے تھے جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے۔ ابن اسحاق نے اس ضمن میں ایک بہت دلچسپ روایت بیان کی ہے کہ ایک رات ابوسفیان بن حرب، ابوجہل بن ہشام اور اخنس بن شریک بغیر کسی وعدے کے الگ الگ نکلے اور کاشانۂ نبوت پہنچے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز اور تلاوت قرآن میں مشغول تھے یہ تینوں رات بھر الگ الگ بیٹھ کر اور ایک دوسرے سے بے خبر قرآن سنتے رہے، صبح جب یہ لوگ واپس ہوئے تو راستے میں اتفاقاً ایک دوسرے سے ملاقات ہو گئی سب نے آپس میں لعنت ملامت کی کہ اب آئندہ ایسا نہیں کریں گے ورنہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو اس کے دل میں وسوسے پیدا ہوں گے'' لیکن دوسری رات پھر یہی واقعہ پیش آیا، پھر لعنت و ملامت اور عہد و پیمان کا تبادلہ ہوا۔ لیکن بایں ہمہ تیسری رات وہ پھر وہاں پہنچے اور رات بھر قرآن سنتے رہے۔

علم الاعجاز کا ارتقا:

لہٰذا اعجاز قرآن کی جانب مسلمان اہل علم کی خصوصی توجہ ایک فطری بات تھی اور دھیرے دھیرے اس موضوع نے مستقل بالذات علم کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کے ابتدائی خدوخال ہمیں ابن قتیبہ کی کتاب ''تأویل مشکل القرآن'' امام ابوالحسن اشعری کی ''

مقالات الاسلامیین، جاحظ کی ''حجج النبوۃ'' اور ابوالحسین خیاط کی کتاب ''الانتصار میں ملتے ہیں۔ مفسرین کرام نے اس موضوع پر اپنی تفسیروں میں بھی جابجا گفتگو کی ہے چنانچہ طبری نے ''جامع البیان'' میں ابوعبیدہ نے ''مجاز القرآن'' میں اور فراء نے ''معانی القرآن'' میں متعدد مقامات پر اعجاز قرآن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

تیسری صدی ہجری کے اواخر سے ہی اعجاز قرآن کے موضوع پر مستقل کتابیں معرض وجود میں آنے لگیں ان میں سے اکثر کا نام ''نظم قرآن'' تھا۔ جاحظ متوفی ۲۵۵ھ نے اسی نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا ذکر باقلانی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں ابوزید بلخی، احمد بن سلیمان متوفی ۳۲۲ھ اور ابوبکر احمد بن الاخشید متوفی ۳۲۶ھ نے بھی اسی عنوان سے رسالے لکھے۔ آخر الذکر کے رسالے کا حوالہ زمخشری نے ''کشاف'' میں کیا ہے۔

خاص اعجاز قرآن کے نام سے پہلی کتاب ابوعبداللہ محمد بن زید واسطی ومعتزلی متوفی ۳۰۶ھ نے لکھی کتاب کا نام ''اعجاز القرآن فی نظمہ وتالیفہ'' تھا۔ ملا کاتب چلپی نے ''کشف الظنون'' میں لکھا ہے کہ امام عبدالقاہر جرجانی نے اس کتاب کی دو شرحیں لکھی ہیں۔ اس کے بعد قاضی ابوبکر باقلانی کا عظیم الشان کارنامہ ''اعجاز القرآن'' منصۂ شہود پر آیا یہ کتاب پہلی بار پروفیسر عبدالعلیم سابق صدر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی۔ چوتھی صدی ہجری میں لکھی جانے والی دوسری کتابوں میں قاضی عبدالجبار معتزلی متوفی ۳۱۵ھ کی ''اعجاز القرآن'' ابوالحسن علی بن عیسی الرمانی متوفی ۳۸۴ھ کی کتاب ''النکت فی اعجاز القرآن'' اور ابوالحسن خطابی متوفی ۳۸۶ھ کی تصنیف ''بیان اعجاز القرآن'' شامل ہیں۔ پانچویں صدی میں امام عبدالقاہر جرجانی کی کتاب ''دلائل الاعجاز'' نے گزشتہ تمام کاموں پر خط نسخ پھیر دیا بعد کی صدیوں میں یہ کتاب معرفت اعجاز قرآن کی کلید بن گئی، اور آج بھی اپنے موضوع پر سب سے اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ جرجانی نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس کا نام ''الشافعیہ'' ہے۔ اسی صدی میں ابن حزم ظاہری نے بھی اعجاز قرآن کو اپنا موضوع بنایا۔ چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد فلسفی متوفی ۵۹۵ھ نے اپنی کتاب ''فصل المقال'' میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ساتویں صدی میں اعجاز قرآن پر بہت ساری کتابیں لکھی

گئیں جن میں سے دو قابل ذکر ہیں ایک امام فخر الدین رازی متوفی ٦٠٦ھ کی کتاب "نهاية الايجاز في دراية الاعجاز" اور دوسری ابن ابی الاصبع متوفی ٦٥٤ھ کی کتاب ''بدیع القرآن'' ہے۔ آٹھویں صدی میں یحییٰ بن حمزہ علوی متوفی ٨٤٩ھ نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب ''الطراز فی اسرار البلاغۃ وعلوم حقائق الاعجاز'' تصنیف کی جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ نویں صدی ہجری میں برہان الدین عمر بقاعی متوفی ٨٨٥ھ نے اپنی کتاب ''نظم الدرر فی تناسق الآیات والسور'' میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کتاب میں اعجاز قرآن کو محور بنا کر پورے قرآن کی تفسیر کی گئی ہے۔ بقاعی کے اس عمل کی زبردست پزیرائی ہوئی۔ بعد کی صدیوں میں انھیں کتابوں کی شرح وتوضیح اور گزشتہ افکار وآراء کی جمع وتالیف سے زیادہ کوئی کام نہیں ہوا مثلاً امام جلال الدین سیوطی متوفی ٩١١ھ نے اپنی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' کی ایک فصل ''فی وجوہ الاعجاز'' کے نام سے تحریر کی اور اس میں متقدمین کی جملہ آراء کو جمع کر دیا۔ البتہ گزشتہ صدی میں مصر کے ایک جلیل القدر عالم دین، ادیب اور ناقد سید مصطفیٰ صادق رافعی نے ''اعجاز القرآن'' کے نام سے ایک اہم کتاب تصنیف کی، ادیب مصر سعد زغلول نے اس کتاب کو ''کتاب محکم'' قرار دیا اور لکھا کہ: ''یہ قرآن حکیم کے نور کا پرتو ہے'' ڈاکٹر یعقوب صروف اپنی تقریظ میں لکھتے ہیں کہ: ''ہر مسلمان جس کے پاس قرآن ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کتاب کا بھی ایک نسخہ رکھے''۔

وجوہ اعجاز:

اعجاز قرآن کے مختلف ومتعدد پہلو ہیں۔ علماء بلاغت ان پہلوؤں کی تعداد ان کی کیفیت واہمیت سبھی میں مختلف الخیال ہیں، کسی نے دس وجوہ کا ذکر کیا تو کسی نے پندرہ کا، کسی نے اس سے زیادہ کا، اور بعض نے تو وجوہ اعجاز کو ناقابل حصر وشمار قرار دیا۔ کسی نے ایک خاص پہلو کو بے حد اہمیت دی تو دوسرے کو اس میں سرے سے اعجاز ہی نظر نہیں آیا۔ لہٰذا ذیل میں میں صرف بعض ایسے اہم پہلوؤں اور وجوہ کے ذکر پر اکتفا کروں گا جس پر سبھی کا اتفاق ہے۔

۱- قرآن کا اسلوب بیان: یہ ہمارا مرکزی موضوع ہے جس پر آگے تفصیل سے

گفتگو ہوگی۔

۲- قرآن کا طریقۂ تالیف: قرآن کریم کم وبیش تیئس سال کی مدت میں نازل ہوا۔ اور اس کی مختلف سورتوں اور آیات کا نزول حسب ضرورت وحاجت مختلف مقامات، اوقات اور حالات میں ہوا۔ جب بھی قرآن کی کوئی آیت، آیتیں یا سورت نازل ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ اس کو فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھو، اس کو فلاں مقام پر رکھو مثلاً صرف سورۂ بقرہ اور سورۂ انعام کو دیکھیں تو پہلی سورت نو سال کی مدت میں بیاسی بار میں نازل ہوئی۔ جبکہ سورہ انعام ایک ہی بار میں نازل ہوئی لیکن دقت نظم اور فنی وحدت کے اعتبار سے دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ شروع میں نازل ہونے والی آیتیں قرآن میں آخر میں ملیں گی اور بعد میں نازل ہونے والی پہلے۔ یعنی قرآن کی موجود ترتیب اس کے ترتیب نزول سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس شان سے جب قرآن مکمل ہوا تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی ترتیب ونسق اور ربط وانسجام میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ یہ فنی وحدت اور باہمی ترابط میں باقاعدہ خطۂ بحث (synopsis) بنا کر لکھی جانے والی کتابوں سے بھی زیادہ مضبوط ومستحکم ہے۔ اور یہ انسانی طاقت سے باہر کی چیز ہے کیونکہ اسے مستقبل میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا علم نہیں ہے۔ وہ آئندہ لاحق ہونے والی ضرورتوں سے بے خبر ہے لہٰذا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس طرح کوئی کتاب تالیف کر سکے۔ اور اگر کسی نے اس طرح کوئی کتاب بنانے کی کوشش کی تو اس میں باہمی ربط اور موضوعاتی وحدت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

۳- قرآن کے علوم ومعارف: قرآن کریم ایسے علوم ومعارف پر مشتمل ہے اور یہ علوم ومعارف اپنے مقصد کی بلندی، اپنے حجج ودلائل کی پختگی، اپنے نفع کی عمومیت اور اپنے اثر کے حسن وجمال میں اس قدر بلند مرتبت ہیں کہ ایسا کلام کسی انسان کی وسعت وطاقت میں نہیں ہے۔

۴- انسانی ضرورت کی تکمیل: یہ قرآن کے اعجاز کا ایک بہت نمایاں پہلو ہے کہ وہ زمان ومکان سے ماوراء ہر انسان کی ہر ضرورت کی تکمیل کرتا ہے خواہ وہ ضرورت دین سے متعلق ہو یا دنیا سے، تشریع وقانون سے متعلق ہو یا اخلاق وفضائل سے، فرد سے متعلق

ہو یا خاندان، معاشرہ اور نظام حکومت سے۔ ہم دنیا کی قانون ساز مجلسوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ شب و روز خود اپنے بنائے ہوئے قوانین میں تبدیل و تغییر اور حذف و اضافہ میں مصروف ہیں۔ لیکن چودہ سو برس سے قرآنی قانون کی کسی بھی شق میں تبدیلی کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان ہو اور کسی بھی درجے کا انسان ہو وہ دوسرے انسان کی ضرورت و حاجت کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا نہ مستقبل میں پیش آنے والے احوال و حوادث سے باخبر ہوسکتا ہے لہٰذا وہ کبھی بھی کوئی پائیدار اور مستحکم نظام یا قانون بنانے پر قادر نہیں ہے۔ یہ کام صرف خالق کائنات کی شان ہے جو ہر ایک کی ضرورت سے واقف اور جس کا علم ہر زمانے کو محیط ہے۔

۵- کائناتی علوم کے سلسلے میں قرآن کا موقف: قرآن کریم اولا و اخیرا کتاب ہدایت ہے۔ کائناتی علوم جیسے طبیعات، کیمیا، علم الحیوان، ہیئت، ہندسہ، علم النبات اور علم طبقات الارض وغیرہ اس کا موضوع نہیں ہیں لیکن ان تمام موضوعات پر قرآن میں اشارے ملتے ہیں اور وہ اشارے تمام تر اجمال و اختصار کے باوجود کسی بھی عہد میں سائنس کے حقائق سے متصادم نہیں ہیں۔ یعنی ان کے ذکر و بیان میں قرآن نے ایسا انداز اختیار کیا جو سائنس کے تغیر پزیر اصول و قوانین کے باوصف ہر دور کے انسان کو اس کے علم و فہم کے مطابق مطمئن کرتا رہا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان " ومن کل شئی خلقنا زوجین اثنین لعلکم تذکرون " (الذاریات:۴۹) یعنی ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں شاید تم ذکر کرو۔ ابتداءً انسان نے اس آیت سے صرف یہ سمجھا کہ یہ آیت اللہ کی قدرت اور اس کی تخلیق کے تنوع کی دلیل ہے۔ پھر یہ رائے سامنے آئی کہ ''زوجین'' سے مراد دو متقابل چیزیں ہیں خواہ تقابل کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ چنانچہ حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ یہاں مراد شب و روز، زمین و آسمان، شمس و قمر، بحر و بر اور موت و حیات وغیرہ ہیں۔ متاخرین نے کہا کہ یہ تقابل انسان، حیوان اور نباتات میں نر و مادہ کے طور پر ہے۔ آخری نظریہ یہ آیا کہ اس کائنات کی ہر شے جوڑے دار ہے جسے سائنس کی زبان میں الکٹران و پروٹان کہتے ہیں۔ یعنی قرآنی بیان ہر دور کے فہم و استعداد کے مطابق ہے اور یہی اعجاز ہے۔ اس موضوع پر بہت سے کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ڈاکٹر موریس بوکالے کی کتاب '' قرآن، بائبل اور سائنس '' بڑی

شہرت کی حامل ہے۔

۶- قرآن میں غیب کی خبریں- یہ بھی اعجاز قرآن کا ایک مہتم بالشان پہلو ہے۔ اس میں غیب کے بے شمار خبریں ہیں جن پر اطلاع پانا کسی بھی انسان کے قدرت میں نہیں ہے اوران غیوب کا تعلق ماضی، حال اور استقبال تینوں سے ہے۔ ماضی کے غیوب جیسے انبیاء کرام علیہم السلام اور گزشتہ امتوں کی خبریں جن کو جاننے کا کوئی مادی ذریعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں تھا، حاضر کے غیوب جیسے منافقین کی فضیحت اور مسجد ضرار کی حقیقت کا ذکر و بیان، اور مستقبل کے غیوب جیسے رومیوں کی فتح کی خبر جبکہ بظاہر اس کے اسباب موجود نہیں تھے۔ یا مکہ کے حالات میں اسلام کے غلبہ و نصرت کی خبر و غیرہ وغیرہ۔ اسی ضمن میں قرآن کے وہ علمی، سائنسی اور طبی حقائق بھی آتے ہیں جنھیں صدیوں بعد سائنس نے ثابت کیا ہے۔

۷- قرآن کی بے مثل اثر اندازی: قرآن کی تاثیرات اس قدر وسیع، عمیق اور ہمہ جہت ہیں جو ہر معروف و معہود سے مختلف ہیں بلکہ اس کی تاثیر و کامیابی معجزہ اور خرق عادت ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب اس کے تاثیرات کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکی ہے۔

۸- قرآن کا طریقہ اصلاح: قرآن کا طریقہ اصلاح و تربیت بھی معجزانہ شان کا حامل ہے دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوسکتی جو معاشرے کے تمام طبقات کی اصلاح و ہدایت بیک وقت کر سکے۔ انسان کی تربیت کے لیے ایسا حکیمانہ انداز اختیار کیا گیا کہ دنیا کی سب سے سرکش قوم رشک ملائکہ بن گئی۔ ۱۹۲۰ء کے قریب امریکہ میں شراب پر پابندی لگائی گئی یہ پابندی عوام کے زبردست مطالبے، ہنگامے اور توڑ پھوڑ کے بعد لگائی گئی، لاکھوں ڈالر پروپگنڈے اور نفاذ پر خرچ کئے گئے لیکن دس سال ہی میں اس قانون کو واپس لے لیا گیا کیونکہ اسی عوام نے پہلے سے زیادہ بڑے پیمانے پر ہنگامہ کر دیا بے شمار جانوں اور املاک کا نقصان ہوا۔ دراصل یہ ناکامیابی طریقے کی ناکامیابی تھی شراب کی حقیقت نہیں بدلی تھی۔ لیکن جب قرآن نے شراب پر پابندی لگائی تو نہ کوئی شور ہوا نہ جان و مال کا کوئی اتلاف، ظاہر ہے کہ فرق صرف طریقہ اصلاح کا ہے۔

۹- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امی ہونا: اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ظاہر اور اس کے اسباب کے بغیر اس کتاب کے ذریعے معلم کائنات بنا دیا۔ یہ بھی من

جملہ کتاب اللہ کے اعجاز میں سے ہے: بقول شاعر ؎

امی ودقیقہ دانِ عالم　　بے سایہ وسائبان عالم

۱۰- قرآن میں کسی قسم کے تضاد وتناقض کا نہ ہونا۔

تلک عشرۃ کاملہ

قرآن کا اسلوبیاتی اعجاز:

قرآن کریم کے اعجاز کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو اس کے اسلوب بیان کا اعجاز ہے۔ اسی چیز نے سب سے پہلے اس کے مخاطبین کے ذہن وفکر کو متاثر کیا۔ قرآن کے علمی، معارفی اور تشریعی اعجاز تو بعد کے مراحل میں ظاہر ہوئے اور صرف اہل علم و دانش ہی ان پر مطلع ہو سکے۔

اسلوب کا لغوی معنی: عربی زبان میں اسلوب کے کئی معانی ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ الف پر پیش کے ساتھ اسلوب: راستہ، طریقہ، مذہب، ہر دراز راہ، کھجور کے درختوں کی لائن اور درختوں کے درمیان کے راستے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ: " انتم فی أسلوب سوء "یعنی تمہارا چلن ٹھیک نہیں ہے۔ ہر شخص کا راستہ اس کا اسلوب ہے، علاوہ ازیں اس لفظ کا اطلاق ''فن'' پر بھی ہوتا ہے۔ " أخذ فلان فی الأساليب مِنَ القول ای افانين منه "یعنی اس نے کلام میں تفنن اختیار کیا۔

فیروز ابادی نے ''القاموس المحیط'' میں اسلوب کے ان معانی نے علاوہ لکھا ہے کہ اس لفظ کا اطلاق تکبر واستعلاء (الشموخ بالأنف) اور شیر کی گردن پر بھی ہوتا ہے۔

اسلوب کا اصطلاحی معنی: اہل عرب کی اصطلاح میں اسلوب: متکلم کا وہ کلامی طریقہ ہے جو وہ اپنے کلام کی ترتیب وتالیف میں اختیار کرتا ہے اور جس کے ذریعے وہ الفاظ کا انتخاب، معانی کی ادائیگی اور اپنے مقاصد کا اظہار کرتا ہے۔ یا اسلوب مؤلف یا متکلم کے کلام کا وہ رنگ وآہنگ ہے جس کے ذریعے وہ دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔

بنابریں اسلوب قرآن کا مطلب ہوا: لفظوں کے انتخاب اور کلام کی تالیف و ترتیب کا وہ طریقہ جس میں قرآن دوسرے تمام کلام سے منفرد وا لگ ہے۔ ہر کلام کا اپنا خاص اسلوب ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات موضوع اور مقصد کے اختلاف سے ایک ہی متکلم

کے دو کلام کا اسلوب مختلف ہو جاتا ہے۔ کلام الٰہی کا بھی اپنا مخصوص اسلوب ہے۔

واضح رہے کہ اسلوب، مفردات و تراکیب سے بالکل الگ چیز ہے۔ بلکہ وہ ایک ہی قسم کے مفردات و تراکیب کو الگ الگ طریقے سے استعمال کرنے سے وجود میں آتا ہے یعنی اسلوب ایک ہی طرح کے الفاظ و تراکیب کو مختلف طریقے سے برتنے سے باہم مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ناظم و ناثر کا اپنا اسلوب ہوتا ہے جبکہ الفاظ، تراکیب اور انھیں استعمال کرنے کے اصول و قواعد یکساں ہوتے ہیں۔ قرآن کریم بھی عربی زبان کے عام قاعدوں کے مطابق ہے اور انھیں مفردات و تراکیب پر مشتمل ہے جو کسی بھی دوسرے عربی کلام میں پائے جائے ہیں۔ لیکن محض اپنے اسلوب کی انفرادیت سے وہ دوسرے تمام عربی کلام سے منفرد و ممتاز ہے اگر قرآن نے عربی زبان کے قواعد تصنیف و تالیف سے الگ کوئی روش اختیار کی ہوتی تو اس میں اعجاز کی کوئی بات نہ ہوتی، اور اہل عرب کو عذر بھی مل جاتا۔ خود منزل قرآن جل مجدہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ولو جعلناه قرآنا أعجميا لقالوا: لولا فصلت آياته، أأعجمي وعربي" (فصلت: ٤٤) اور متعدد آیات میں قرآن کے خالص عربی میں ہونے کے تاکید فرماتا ہے:

١- وإنه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الأمين على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربي مبين" (الشعراء: ١٩٢-١٩٥)

٢- وكذلك أنزلنا حكما عربيا" (الرعد: ٣٧)

٣- وكذلك أوحينا إليك قرآنا عربيا لتنذر أم القرى ومن حولها" (الشورى: ٧)

٤- حم، والكتاب المبين، إنا جعلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون" (الزخرف: ١-٣)

٥- قرآنا عربيا غير ذي عوج لعلهم يتقون" (الزمر: ٢٨)

یعنی قرآن کریم خالص عربی میں اور عربیت کے ذوق کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اگر وہ کسی بھی دوسرے عربی کلام سے مختلف ہے تو الفاظ و مفردات کے استعمال و

انتخاب اور جملوں کی تالیف وصیاغت ہی میں مختلف ہے۔ چونکہ کسی بھی زبان کی طرح عربی زبان کے بھی سارے مفردات یکساں نہیں ہے۔ بعض ایسے حروف سے مرکب ہوتے ہیں جو باہم متجانس ہوتے ہیں جبکہ بعض دوسرے مفردات کے حروف آپس میں متنافر ہوتے ہیں جن کے تلفظ میں بقدر تنافر کم یا زیادہ ثقالت ہوتی ہے۔ عربی زبان میں کچھ الفاظ مانوس ہوتے ہیں کچھ غریب اور اجنبی ہوتے ہیں، کچھ الفاظ سننے میں خفیف اور رقیق ہوتے ہیں کچھ ثقیل اور کریہہ ہوتے ہیں۔ کچھ لغوی قیاس کے مطابق ہوتے ہیں کچھ اس کے مخالف ہوتے ہیں۔ پھر یہ الفاظ عام و خاص، مطلق و مقید، مجمل و مبین، معروف و منکر، ظاہر و مضمر اور حقیقت و مجاز کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پھر جملوں اور مرکبات کی بھی متعدد، اور مختلف قسمیں ہیں۔ علاوہ ازیں تقدیم و تاخیر، ایجاز و اطناب، وصل و فصل وغیرہ بے شمار چیزیں اسلوب کو متاثر کرتی ہیں۔

اسلوب قرآن کی خصوصیات:

قرآن کریم کے اسلوب کی خصوصیات کا حصر و احاطہ دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ خالق کے کلام کے محاسن و خصائص کا مکمل ادراک مخلوق کے امکان و قدرت میں ہے ہی نہیں۔ علماء نے اپنے اپنے علم و استعداد کے لحاظ سے اسلوب قرآن کے ان خصائص و محاسن کا ذکر کیا ہے۔ جس نے اس کلام کو زبان و بلاغت کا معجزہ بنا دیا ہے اور ان خصائص میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- قرآن کا صوتی نظام: اس سے مراد کلام الٰہی کا لحن اور اس کی سمعی توقیعات ہے۔ قرآن اپنی حرکت و سکون، اتصال و سکوت، مدہ اور غنہ میں ایسے انوکھے نسق و تالیف کا حامل ہے جو سماعت پر غیر معمولی اثر ڈالتا ہے اور دلوں کے لیے بے انتہا کشش کا باعث ہے، مثلاً حروف و کلمات سے مجرد صرف قرآن کا صوتی مجموعہ اگر کسی کے گوش گزار ہو بایں طور پر کہ سامع اتنی دور ہو کہ الفاظ واضح نہ ہوں یا وہ عربی زبان سے ناواقف ہو تو بھی وہ یہ محسوس کرے گا کہ وہ ایک غیر معمولی لحن اور نغمے کو سماعت کر رہا ہے، جو اس کے دل میں ایک ایسی خاص کیفیت پیدا کر رہا ہے جو کسی موسیقی یا شعر میں نہیں ہوتی ہے۔ قرآن کا یہی وہ صوتی آہنگ اور توقیعی نظام تھا جس سے اہل عرب کے کان

سب سے پہلے آشنا ہوئے اور بغیر کسی تردد کے انھوں نے جان لیا کہ یہ آہنگ ان کے تمام اصناف کلام سے مختلف ہے۔

امام حاکم نے اپنے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے اور اسے امام بخاری کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے کہ ایک بار ولید بن مغیرہ نے قرآن سنا تو اس کے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی، ابوجہل کو خبر ہوئی تو اس نے ولید سے اصرار کیا کہ وہ قرآن کے خلاف کچھ کہیں۔ ولید بولا:

> ''میں کیا کہوں؟ خدا کی قسم مجھ سے زیادہ تم میں سے کوئی شاعری کو نہیں جانتا۔ خواہ رجز ہو خواہ قصیدہ خواہ جنات کے اشعار ہوں۔ بخدا یہ کلام ان میں کسی کی طرح نہیں ہے۔ اس میں عجیب حلاوت و طراوت ہے.....''

۲- قرآن کا لسانی حسن و جمال: قرآنی اسلوب کی یہ خصوصیت حروف وکلمات کی ایک خاص ترتیب وتناسق میں پوشیدہ ہے۔ ہر لفظ میں حروف کی ترتیب اور ہر جملے میں الفاظ کی ترتیب کا ایسا نظام ہے کہ اگر قرآن کو تجوید کی رعایت کے ساتھ پڑھا جائے تو ایک سحر آمیز کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ اسلوبیاتی خصوصیت کتاب اللہ کو حفظ کرنے میں بھی مدد ومعاون ہے۔ اس کے اسلوب میں فخامت ہے لیکن کرختگی کا شائبہ نہیں ہے۔ اس میں رقت تو ملتی ہے لیکن کسی قسم مائعیت اور ہلکے پن کا کوئی اثر نہیں ہے۔

۳- عام و خاص کی تسکین: قرآنی اسلوب کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ یہ بیک وقت عوام وخواص، عالم و جاہل اور دانشور اور عام تعلیم یافتہ سبھی کو راضی ومطمئن کرتا ہے۔ ایک عام آدمی بھی اس کی تلاوت سے اسی طرح بہرہ مند ہوتا ہے جیسے زبان و بلاغت کا کوئی ماہر۔ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق اس سے معانی اخذ کرتا ہے جو اس کے عقل وشعور کی قناعت کا سبب ہوتا ہے۔ کسی بھی انسانی کلام کی یہ شان نہیں ہوسکتی کیونکہ کوئی کلام اگر اہل دانش وبینش کو راضی کرتا ہے تو عام لوگ اس سے راضی نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ اسے سمجھ ہی نہیں سکتے اور جس کلام سے عام لوگ راضی ہوتے ہیں اس سے دانشور راضی نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ وہ ان کے معیار سے بہت نیچے اور پست ہوتا ہے۔

۴- عقل وجذبات دونوں کی قناعت: قرآنی اسلوب قلب ونظر اور دل ودماغ کو

ایک ساتھ مخاطب کرتا ہے۔اس اسلوب میں صداقت اور حسن دونوں یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ اسلوب عقل اور جذبات دونوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ مثلاً عقلی استدلالات جذبات کو متاثر نہیں کرتے اور نہ جذباتی باتیں عقل کو راضی کرتی ہیں لیکن یہ قرآنی اسلوب کا انوکھا پن ہے کہ اس کے علمی دلائل و براہین جذبوں کی تسکین کا بھی کام کرتے ہیں مثلاً قرآن منکرین بعث وقیامت کے خلاف دلیل پیش کرتا ہے:" ومن آياته انك ترى الأرض خاشعة ، فإذاأنزلنا عليها الماء اهتزت وربت و ان الذى أحياها لمحى الموتى إنه على كل شيئ قدير "(فصلت:۳۹)

اس اسلوب کی عظمت و براعت ملاحظہ کیجئے جو بیک وقت عقل کو قانع بھی کر رہا ہے، دلوں کی دھڑکن بھی تیز کر رہا ہے اور جذبات کو لطف بھی فراہم کر رہا ہے۔ انسانی اسلوب یا تو عقل کو راضی کرتا ہے یا جذبات کو اور اگر کبھی کسی کلام میں ان دونوں متضاد پہلوؤں کی ایک ساتھ رعایت ملتی ہے تو کبھی کبھی اور کہیں کہیں ۔ جبکہ قرآن اول تا آخر اس معاملے میں یکساں ہے۔تمام اہل علم کے نزدیک دو ہی اسلوب ہوتے ہیں:

الف- اسلوب علمی ، جو عقل کو مخاطب کرتا ہے اور سائنس ، فلسفہ اور ریاضیات وغیرہ موضوعات میں استعمال ہوتا ہے۔

ب- ادبی اسلوب، جو جذبات اور قلبی احساسات کو اپنا مخاطب بناتا ہے اور شاعری اور ادبی موضوعات میں استعمال ہوتا ۔لیکن قرآن کا اسلوب نہ خالص علمی ہے اور نہ خالص ادبی۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ وہ بیک وقت علمی وادبی دونوں ہے۔

۵- قرآن کا باہمی ارتباط: قرآن اپنے اجزاء کے باہمی ترابط وتناسب میں ہر کلام سے ممتاز ومنفرد ہے۔جبکہ اس کے مقاصد مختلف ہیں اور اس کے موضوعات متعدد ہیں،لیکن بایں ہمہ اس کے کلمات، آیات اور سورتیں ایسے محکم انداز میں مربوط ہیں جیسے وہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔قرآنی موضوعات میں اس قدر کثرت وتنوع ہے کہ اس میں کسی محکم ربط کا وجود نہیں ہونا چاہیے چہ جائیکہ ایسا عالی شان ربط وتناسب جو وحدت موضوع کے بعد بھی کسی کتاب میں ممکن نہیں ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے اور اس بات کی دلیل کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔اگر چہ یہ کتاب ہر قسم کی موضوعاتی تقسیم سے خالی ہے لیکن ایک موضوع سے دوسرے موضوع اور ایک معنی سے دوسرے معنی کی

طرف انتقال اور حسن تخلص میں کوئی کتاب اس کی نظیر نہیں ہے۔

۶- اجمال وتفصیل کی جامعیت: اجمال وتفصیل دو مقابل ومتضاد مقصد ہیں جو کسی ایک کلام میں اکٹھا نہیں ہو سکتے۔ کلام یا تو مجمل ہوتا ہے یا مفصل ہوتا ہے موجز ہوتا ہے یا مبین ہوتا ہے۔ لیکن قرآن تنہا ایک کلام ہے جو اس قاعدے سے ماوراء ہے۔ قرآن کا ہر جملہ اپنی جگہ واضح ہے اور ہر بیان سے بے نیاز ہے، لیکن اس جملے میں اگر غور وفکر کیا جاتا ہے تو معانی کا ایک لامتناہی سلسلہ برآمد ہوتا ہے۔ عام کلام کے برخلاف نہ قرآن کا ایجاز ادائیگی معنی میں مخل ہوتا اور نہ اس کا اطناب قاری سامع کے لیے مملّ ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عام کلام کی طرح نہ قرآن میں ایجاز ہے نہ اطناب اس لیے کہ کلام میں یا تو ایجاز ہوتا ہے یا اطناب اور جہاں ایجاز ہوتا ہے وہاں اطناب نہیں ہوسکتا اور اسی طرح عکس۔ لیکن کلام الٰہی ان دونوں وصف کا جامع ہے۔ لہٰذا بعض اہل علم کے نزدیک قرآن کے لیے ایجاز و اطناب کی عام اصطلاح کے بجائے ''احکام'' وتفصیل'' کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔ خود قرآن کا فرمان ہے:

"كتاب أحكمت آياته ثم فصلت من لدن حكيم خبير" (هود:۱)

۷- قلت الفاظ اور کثرت معانی: قرآن کی اسلوبی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ الفاظ کا کم سے کم استعمال کرتا ہے لیکن اس قلت کے باوجود بھی وہ الفاظ معنی کی ادائیگی میں پوری طرح کامیاب رہتے ہیں۔ کسی بڑے ادیب و بلیغ کے کلام میں بھی بعض جملے اس صفت کے حامل ہو سکتے ہیں یا کسی شاعر کے دیوان کے چند اشعار اس خاصیت پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ لیکن کسی بھی زبان میں کوئی پورا مضمون یا مکمل قصیدہ ایسا نہیں مل سکتا ہے جو اول تا آخر اس شان کا حامل ہو۔

۸- تفنن کلام: قرآن کریم ایک ہی معنی کو مختلف الفاظ اور طریقوں سے ذکر کرتا ہے، کلام میں تنوع وتفنن کے اعتبار سے وہ ہر کلام سے بلند ہے۔ قرآنی اسلوب کی یہ خصوصیت اول وہلہ میں قاری کو اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔ اسلوب قرآن کی یہ خصوصیت ان اسباب میں سے ہے جو قرآن پڑھنے والے کو کبھی بھی اکتانے نہیں دیتی، خواہ شب وروز اسکو پڑھتا رہے۔ اگر اس خصوصیت کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو پورے مصحف کو نقل کرنا پڑ جائے۔ میں اس کلامی تفنن اور تعبیری تنوع کی صرف چند مثالیں پیش کرنے پر

اکتفا کرتا ہوں۔

الف- قرآن مخاطب سے کسی فعل کو کرنے کا مطالبہ مختلف الفاظ اور طریقوں سے کرتا ہے۔

۱- صراحۃً لفظ ''أمر'' کے ذریعے: "إن الله يامركم أن تؤ دواالأمانات إلى أهلها " (النساء:۵۸)

۲- لفظ ''کتب'' کے ذریعے کسی کام کے فرض ہونے کی خبر دیکر: " كتب عليكم الصيام " (البقرۃ:۱۸۳)

۳- لفظ ''علیٰ'' کے ذریعے خبر دینا کہ لوگوں کو ایسا کرنا یا لوگوں پر ایسا ضروری ہے۔ مثلاً: ''ولله على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا '' (آل عمران:۹۷)

۴- اس بات کی خبر دینا کہ فلاں سے یہ کام مطلوب ہے، مثلاً: والمطلقات تيربصن بأنفسهن ثلاثة قروء " (البقرہ:۲۲۸)

۵- کسی کے بارے میں ایسی خبر دینا کہ اس سے متعلق کام دوسروں سے مطلوب ہو مثلاً: "ومن دخله كان آمنا" (آل عمران:۹۷) یعنی مخاطبین سے حرم میں داخل ہونے والوں کو امن دینے کا مطالبہ ہے۔

۶- فعل امر کے صیغے کے ساتھ کسی کام کا مطالبہ کرنا مثلاً: " حافظوا علىٰ الصلوات و الصلاة الوسطىٰ " (البقرۃ:۲۳۸)

۷- کسی کام کے بارے میں یہ خبر دینا کہ اس کا کرنا اچھا ہے، مثلاً: "ويسألونك عن اليتامى قل: إصلاح لهم خير" (البقرہ:۲۲۰)

۸- کسی کام کو اچھا ہونے سے موصوف کرنا، مثلاً: " ولكن البرمن اتقىٰ "(البقرہ:۱۸۹)

۹- کسی کام کو فرضیت سے متصف کرنا، مثلاً: "قد عَلِمْنَا مافرضنا عليهم فى أزواجهم " (الاحزاب:۵۰)

۱۰- کسی کام پر وعدہ اور ثواب مرتب ہونے کی بات کرنا، مثلاً: " من ذاالذى يقرض الله قرضا حسنا فيضا عفه له و له أجر كريم " (الحدید:۱۱)

۱۱- فعل منفی کا استفہام کے بعد ذکر کرنا، مثلاً: " أفمن تخلق كمن لا تخلق

أفلا تذكرون" (النحل:۱۷) یعنی ذکر کرو اور یاد کرو۔

۱۲- امید کے بعد فعل کو ذکر کرنا، جیسے: " لعلكم تشكرون " (الحج:۳۶) یعنی شکر کرو۔

۱۳- کسی کام کو نہ کرنے کی برائی کا بیان کرنا جیسے: " ومن لم يحكم بماأنزل الله فأولئك هم الكافرون " (المائدہ:۴۴)

ب- امر ہی کی طرح نہی کے لیے بھی قرآن متعدد طریقے استعمال کرتا ہے، یعنی کسی کام سے روکنے یا اسے نہ کرنے کا مطالبہ بھی مختلف الفاظ وتعبیرات میں کرتا ہے۔

۱- صراحت کے ساتھ لفظ ''نہی'' کا استعمال کر کے، مثلاً: "إنما ينها كم الله عن الذين قاتلو كم فى الدين و أخر جو كم من ديار كم و ظاهروا على إخراجكم أن تولوهم" (الممتحنۃ:۹)

۲- مادہ ''تحریم'' کے بیان کے ساتھ مثلاً: إنما حرم ربى الفواحش ماظهر منها و مابطن والا ثم والبغى " الخ (الاعراف:۳۳)

۳- کسی فعل کے حلال وجائز ہونے کی نفی کر کے، جیسے: لايحل لكم أن ترثوا النساء كرها" (النساء:۱۹)

۴- لفظ ''لا'' کے ذریعے کسی کام سے روکنا، مثلاً: ولا تقربوا مال اليتيم إلا بالتى هى أحسن " (الانعام:۱۵۲)

۵- کسی کام کو ''بر'' یعنی نیکی نہ ہونے کے ساتھ متصف کر کے، مثلاً: وليس البر بأن تأتوا البيوت من ظهور ها " (البقرۃ:۱۸۹)

۶- کسی فعل کو ''شر'' سے موصوف کر کے، جیسے: " ولايحسبن الذين يبخلون بما آتا هم الله من فضله هو خيراً لهم ، بل هو شر لهم "(آل عمران:۱۸۰)

۷- کسی فعل کو وعید وعذاب کے ساتھ ذکر کرنا بھی اس سے باز رکھنے کا ایک طریقہ ہے مثلاً: سونا وچاندی جمع کر کے اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والوں کے بارے میں فرمایا جارہا ہے: " والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقو نهافى سبيل الله فبشرهم بعذاب أليم" (التوبہ:۳۴)

۸- فعل کو ''اثم'' یعنی گناہ کے ساتھ منسوب کر کے، مثلاً: "فمن بدله بعد ما

سمعه فإ نما اثمه على الذين يبد لو نه "(البقرة:١٨١)

٩- کسی فعل کو"رجس"یعنی ناپاک یا شیطان کا عمل قرار دینا۔"یـأ یھاالـذین آمنـوا إنما الخمر و المسیر والأ نصاب والا زلام رجس من عمل الشیطان ......"(المائدہ:٩٠)

١١- استفہام کی صورت میں کسی کام سے باز رہنے کا مطالبہ کرے،مثلاً:" فھـل أنتم منتھون " (المائدہ:٩١)

ج- امرونہی کی طرح ہی کسی کام کے اباحت کے بیان میں بھی قرآنی اسلوب نے بے حد تفنن سے کام لیا ہے اوراس کے بہت سے طریقے استعمال کئے ہیں۔ ان میں کچھ حسب ذیل ہیں:

١- راست طور پر مادۂ"حل"یعنی جواز کے ساتھ،جیسے:" أحلت لکم بھیمة الأنعام"(المائدہ:١)

٢- ایسے قرینے کے ساتھ صیغۂ امر کا ذکر جو اسے اس کی معنیٰ اصلی سے مجرد کردے۔جیسے:" و کلوا واشربوا" (البقرہ:٦٠)

٣- کسی فعل سے " اثم "یعنی گناہ کی نفی کا ذکر کرکے،مثلاً:" فمـن اضطرغیر باغ ولا عاد فلا إثم علیه " (البقرة:١٧٣)

٤- کسی فعل سے"حرج" کی نفی کرکے،جیسے:" لیس علـی الأعمی حرج ولا علـی الأعـرج حرج ولا علی المریض حرج " (النور:٦١)یعنی ان لوگوں کے لیے جہاد میں شریک نہ ہونے کی اجازت ہے۔

٥- لفظ"جناح" کی نفی کے ساتھ فعل کا ذکر بھی اس کے اباحت کی دلیل ہے: مثلاً : " فمـن حـج البیـت أواعتـمـر فـلا جـناح علیه أن یطوف بھما " (البقرة:١٥٨)

٦- استفہام کی صورت میں کسی چیز کی حرمت کا انکار کرکے،جیسے:" قل مـن حرم زینة الله التی أخرج لعبا دہ و الطیبات من الرزق(الاعراف:٣٢)

٧- کسی چیز کو بطور احسان ذکر کرکے یا اسے رزق حسن قرار دے کر بھی قرآن اس کی اباحت کو بیان کرتا ہے۔جیسے:ومـن ثـمـرات النخیل والأ عناب

تتخذون منه سکرا و رزقا حسنا"۔(النحل:٦٧)۔

۸- یہ قرآن کے تفنن کلام اور تصریف قول کی چند مثالیں ہیں۔ غیر عربی زبان میں ان کے حسن و جمال کو کما حقہ بیان بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایک زبان کی لطافتوں اور باریکیوں کو کسی دوسری زبان میں بیان کرنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن امر ہے۔ اس طرح دوسرے سیکڑوں ہزاروں معانی کو بیان کرنے میں بھی قرآن نے یونہی اعلی درجے کی بلاغی تعبیروں سے کام لیا ہے۔

۹- معنوی دلالت کی کثرت: یہ بھی قرآنی اسلوب کی ایک خوبی ہے کہ وہ کثیر الدلالہ ہوتا ہے اور یہ کلام کی بلاغت کی ایک دلیل ہے۔ قرآن کی کسی آیت میں آپ غور کیجئے تو معنی کے نئے نئے پہلو روشن ہوتے جائیں گے۔ مثلاً ارشاد ربانی ہے:" من کان عدو اً لله و ملا ئکته و رسله و جبریل و میکال فان الله عدو للکافرین " (البقرہ:۹۸) یہ کلام مندرجہ ذیل باتوں پر دلالت کر رہا ہے:

الف- فرشتوں سے عداوت و دشمنی اللہ سے دشمنی ہے۔

ب- فرشتوں کی دشمنی کفر ہے۔

ج- جبریل و میکائیل فرشتوں میں سے ہیں۔

د- یہ دونوں بڑے فرشتوں اور رسل ملائکہ میں سے ہیں۔

ھ- فرشتوں میں بھی رسول ہوتے ہیں۔

و- رسل انسان سے دشمنی بھی رسل ملائکہ سے دشمنی جیسی ہے۔

ذ- یہودی جبریل و میکائیل علیہا السلام کے دشمن ہیں۔

ح- یہودی خدا کے بھی دشمن ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

۱۰- تنوع خطاب: قرآنی اسلوب اس شان کا ہے گویا کوئی آسمانی خطیب اہل زمین سے مخاطب ہے۔ کبھی داہنے گھومتا ہے کبھی بائیں کبھی فرد کو مخاطب کرتا ہے کبھی جماعت کو اور کبھی ساری انسانیت کو کبھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہوتا ہے اور کبھی آپ کی امت سے۔ اور بطور التفات واحد سے خطاب کرتے کرتے جمع سے خطاب شروع ہوجاتا ہے، تو کبھی اس کے

برعکس۔مثلاً: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " وما أرسلنا من قبلك إلا رجالا نوحی إليهم " یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے، پھر معاً بطور التفات عام لوگوں سے خطاب شروع ہو جاتا ہے:" فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون بالبينات والزبر" پھر التفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو جاتا ہے: " وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم و لعلهم يتفكرون " (النحل،۴۳،۴۴)

علماء فرماتے ہیں کہ خطاب کا تنوع اور التفات کی کثرت قاری اور سامع کو متنبہ کرنے کے لیے ہوتے ہیں، انھیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں، اور معانی ومقاصد کو ان کے دلوں میں راسخ کرتے ہیں۔

قرآنی اسلوب کی یہ وہ خصوصیات ہیں جس میں کوئی بھی آسمانی یا زمینی کتاب اس کے مماثل نہیں ہے۔اس اسلوب کی اور بہت سی خصوصیات ہیں جن میں دوسرے کلام بھی اگر چہ شریک ہیں لیکن قرآن میں یہ بلاغت کے جس اعلیٰ درجے سے متصف ہیں اس طرح کسی دوسرے کلام میں نہیں ہیں۔ان خصوصیات میں سے، حذف، عود علی بدء، اجمال کے بعد تفصیل، بعض چیزوں پر اقتصار، وجوہ وصل وفصل عطف کا تنوع، اعتراض، استفہام، شرط، دو متصل امور کے درمیان فصل، حال کا استعمال، تکرار، بدل، وصف، تردید، تقدیم وتاخیر، تخلیص، تعمیم وتخصیص، مقابلہ وتفصیل، ابہام کے بعد توضیح، اور قول کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ دلیل کو بھی متضمن ہو وغیرہ۔

انھیں خصوصیات عامہ میں سے ایک خصوصیت قرآنی آیات کی موزونیت ہے جو مکی سورتوں میں بہت زیادہ ملتی ہے۔اگر چہ یہ موزونیت اپنے ظاہر کے اعتبار سے سجع ہی لگتی ہے لیکن علماء بالخصوص متقدمین نے اس کے سجع ہونے کا انکار کیا ہے اور اس کو فواصل، مقاطع یا رؤس آیات کا نام دیا ہے۔فواصل زیادہ معروف ومتداول اصطلاح ہے۔باقلانی نے " اعجاز القرآن " میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے جس کا نام " فی نفی السجع عن القرآن " ہے۔اس میں انھوں نے سجع اور فواصل کا فرق بیان کیا ہے۔یہی اشاعرہ کی رائے ہے جسے انھوں نے امام ابوالحسن اشعری سے نقل کیا ہے۔ باقلانی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ: شریعت میں سجع کی مذمت آئی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے:"أسجاعة كسجاعة الجاهليه" اور أسجعاً كسجع الكهان"یعنی کیا جاہلیت اور کاہنوں کے سجع کی طرح سجع کہتے ہو، کہہ کر اس اسلوب سے منع فرمایا ہے، لہٰذا خود قرآن میں سجع ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اگر قرآن سجع ہوتا تو اسالیب عرب کے موافق ہوتا اور اس کا اعجاز ثابت نہ ہوتا اور اگر قرآن کو معجزانہ سجع کہا جائے تو اسے معجزانہ شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں جہاں قرآن میں سجع معلوم ہوتا ہے وہ سجع گوئی کے عام اصول وقواعد کے مطابق بھی نہیں ہے۔ اور قرآنی فواصل اور سجع کے درمیان سب سے اہم فرق یہ ہے کہ سجع فی نفسہ مقصود ہوتا ہے اور فواصل فی نفسہ مقصود نہیں ہوتے، اول الذکر میں معنی لفظ کے تابع ہوتا اور فواصل میں لفظ معنی کے تابع ہوتا ہے۔

رُمانی ''النکت فی اعجاز القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ: سجع کو'' سجع الحمامہ'' (کبوتر کی آواز) سے لیا گیا ہے جس میں محض ہم شکل آوازیں ہوتی ہیں اگر چہ سجع معنی سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ معنی اس سے بہ تکلف اخذ کیا جاتا ہے۔ جبکہ فواصل وہ حروف ہیں جو مقاطع میں ہم شکل ہونے کے ساتھ ساتھ معنی کی مزید وضاحت کرتے ہیں اور سجع کی پوری طرح لفظی رعایت بھی نہیں کرتے ہیں۔

لیکن ابوالہلال عسکری، خفاجی اور ابن اثیر وغیرہ نے قرآن میں سجع کے وجود کا اعتراف کیا ہے اور سجع کو مذموم ومحمود دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذکورہ بالا فرمان میں مطلق سجع کو مذموم نہیں قرار دیا بلکہ ایسے سجع کی مذمت کی ہے جو جاہلیت کی طرح ہے یا کاہنوں کے سجع کے مثل ہے۔ چنانچہ قرآن کے علاوہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں سجع موجود ہے جیسے ارشاد گرامی ہے: '' أعيذه من االهامَّة و السامة و كل عين لامّة '' بلکہ بعض مقام پر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجع کی رعایت میں نحوی وصرفی قواعد کو نظر انداز فرمادیا۔ آپ کا ارشاد ہے:"ارجعن مازورات غير ماجورات " یہاں قیاس کے لحاظ سے ''موزورات'' ہونا چاہیے۔

مختصر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی اسلوب میں سجع تو ہے لیکن قرآن اپنے اسلوب کی مشترکہ تمام خصوصیات کی طرح دوسرے ہر کلام سے اس خصوصیت میں بھی ممتاز ومنفرد ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ اس امتیاز، اور سجع کی مخصوص مفہوم کے پیش نظر اسے

فواصل ہی کہا جائے۔

بعض شبہات اوران کا تدارک:

اس مقام پر استکمال موضوع کے طور پر قرآنی اسلوب پر وارد اسلام دشمنوں کے بعض شبہات کا ذکر بھی مناسب ہے۔ اگر چہ یہ شبہات صرف اعتراض برائے اعتراض کے قبیل سے ہیں لیکن ان سے واقفیت بے سود نہیں ہے۔ بلکہ ان سطحی شبہات سے قرآنی اسلوب کی عظمت اور نکھر کر سامنے آتی ہے۔

پہلا شبہہ یہ ہے کہ قرآن میں دو متعارض اسلوب ہیں۔مکی سورتوں کا اسلوب معاشرتی پستی کی نشاندہی کرتا ہے۔جس میں سختی، حدت، غضب، دھمکی اور سب وشتم کے عناصر ملتے ہیں جبکہ مدنی سورتوں کا اسلوب مدنیت، ارتقاء اور تہذیب وثقافت کا غماز ہے۔جس میں مذکورہ عناصر نہیں ملتے ہیں۔اس شبہے کی غرض وغایت یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے اور عام بشری کلام کی طرح اپنے ماحول ومعاشرے سے متأثر ہے۔ یہ شبہہ بالکل بے اصل و بے حقیقت ہے۔مکی سورتوں کی طرح مدنی سورتوں میں بھی شدت ملتی ہے بلکہ بعض مقام پر یہ شدت مکی سورتوں میں وارد شدت سے بھی کہیں زیادہ ہے۔رہی مکی سورتوں میں سب وشتم کی بات تو یہ محض کذب وافترا ہے، جسے معروف معنوں میں سب وشتم کہتے ہیں وہ قرآن میں کہیں نہیں ہے نہ مکی سورتوں میں اور نہ مدنی سورتوں میں۔ جہاں تک وعید و عذاب کی کثرت کا تعلق ہے تو اس کا سبب بداوت وحضارت یا دیہاتیت اور شہریت نہیں ہے بلکہ احوال وظروف کے فرق کے سبب ہے۔ جو اہل مکہ اور قریش کی دشمنی و ایذا رسانی کو جانتا ہے اس کے لیے وعید وعذاب کا کثرت سے ذکر چنداں تعجب خیز نہیں ہے۔اس شبہے کے جواب میں مزید بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اسی قدر پر اکتفاء کرتا ہوں۔

دوسرے شبہے کا مفاد یہ ہے کہ مکی سورتیں چھوٹی ہیں جبکہ مدنی سورتیں بڑی بڑی ہیں اور یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامی ماحول سے تاثر کی دلیل ہے (معاذ اللہ) یہ شبہہ بھی خلاف واقع ہے اس لیے کہ سورۂ انعام جیسی طویل سورت مکی ہے اور سورہ

"اذا جـــاء" جیسی مختصر سورت مدنی ہے۔ اور سورتوں یا آیات کا چھوٹا ہونا مخاطب کے فکری پستی کی دلیل نہیں ہے جیسا کہ شبہہ کرنے والوں کا گمان ہے بلکہ یہ اس کے برعکس ایجاز کی دلیل ہے اور ایجازِ کلام مخاطب کی فکری بلندی کی دلیل ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ مکہ میں نازل ہونے والی آیات وسور اکثر چھوٹی ہیں اور مدنی سور و آیات عموماً بڑی ہیں لیکن اس کا سبب وہ نہیں ہے جو شبہہ کرنے والوں کا باطل گمان ہے بلکہ اس کا حقیقی سبب احوال وموضوعات کا اختلاف ہے۔

تیسرے شبہے کا خلاصہ یہ ہے کہ مکی سورتیں تشریع وقانون سازی سے خالی ہیں جبکہ مدنی سورتیں ان سے پُر ہیں اور اس کا سبب ان کے گمان میں یہ ہے کہ مکہ میں پیغمبر اسلام کا ساتھ اور ان کا رہنا سہنا جاہلوں کے ساتھ تھا جبکہ مدینے میں انھیں اہل کتاب اور ان کے علماء کا ساتھ ملا اور یہ انھیں کی رفاقت کا اثر ہے۔ یہ شبہہ بھی باطل ہے۔ کیونکہ مکی آیات قانون سازی سے بالکل خالی نہیں ہیں۔ مقاصد دین پانچ ہیں اور اسلام کا پورا قانون انھیں کے گرد گھومتا ہے اور یہ مقاصد ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور یوم آخرت وتقدیر پر ایمان ۔۲- حفظ نفس، ۳- حفظ عقل، ۴- حفظ نسل، ۵- حفظ مال اور ان مقاصد میں سے کوئی ایسا مقصد نہیں جنھیں مکی سورتوں اور آیتوں میں اجمالاً موضوع نہ بنایا گیا ہو۔ بلکہ اگر مقصد اول کو دیکھیں تو اس کا ذکر مکی سورتوں میں مدنی سورتوں سے زیادہ ہے۔ مدنی سورتوں میں تشریع کی کثرت کا اصل سبب مسلم معاشرے کی حاجت وضرورت ہے۔ اور درحقیقت قرآن نے تعلیم وتربیت کا ایک تدریجی اصول اختیار کیا ہے جو حکمت کے عین مطابق ہے۔ اگر مدنی سورتوں میں کثرت تشریع اہل کتاب کی صحبت کے سبب ہوتی تو ان کے قوانین کا اس قدر ردوابطال ان میں نہ ہوتا بلکہ اسلامی قوانین بھی اہل کتاب کے قوانین جیسے ہوتے۔

قرآنی اسلوب پر چوتھا شبہہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں محسوس اشیاء کی قسم کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جیسے: ضحیٰ، لیل، تین، زیتون، طور سینین وغیرہ۔ اور یہ مکی سورتوں ہی میں ملتا ہے۔ جو مکہ کے بے علم معاشرہ اور اس کے پست فکر اصحاب سے تاثر کے سبب ہے۔ اس شبہے کے برخلاف تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ اہل مکہ سارے عرب سے زیادہ

بلند نظر، اعلی ذوق، اور ذہانت و فطانت کے حامل تھے۔ ان حسی اشیاء کی قسم اور ان کے ذکر کا سبب معاشرتی انحطاط نہیں ہے بلکہ مقتضیٰ حال کی رعایت ہے۔ مکے کا معاشرہ شرک میں ڈوبا تھا اور انھیں بے جان و محسوس اشیاء کی عبادت کرتا تھا۔ ان کا بار بار ذکر کر کے قرآن مشرکین کے ذہن و فکر میں یہ بات راسخ کرنا چاہتا تھا کہ یہ چیزیں بے جان اور بے قدرت و اختیار ہیں، اگر ان کی کسی خصوصیت کے سبب ان کی پرستش کر رہے ہو تو ان کا خالق جس نے ان کو اور ان میں پائی جانے والی خصوصیات کو پیدا کیا ہے وہ زیادہ مستحق عبادت اور لائق پرستش ہے۔" أفمن يخلق كمن لا يخلق أفلا تذكرون "۔

ایک شبہہ اور ہے جسے مستشرقین نے خاص کر بڑے زور و شور کے ساتھ ذکر کیا ہے اس شبہے کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن اپنے اسلوب بیان میں بے حد غیر منظّم اور بے ترتیب ہے اس میں مختلف اغراض و مقاصد کے لیے الگ الگ ابواب و فصول نہیں ہیں جیسا کہ ہر کتاب میں ہوتا ہے بلکہ قرآن کے تمام اغراض و موضوعات آپس میں خلط ملط ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کا عام نظام تالیف کے مخالف ہونا کوئی عیب نہیں ہے بلکہ یہ ایک دلیل ہے کہ یہ کتاب کسی انسان کی تصنیف کردہ نہیں ہے اور یہ قرآن کے اعجاز بیان کی بھی دلیل ہے۔ کیونکہ مختلف موضوعات کے باہمی اختلاط کے باوصف قرآنی آیات و سور کا تناسب برقرار ہے اور ایسا کرنا کسی بھی انسان کے قدرت اختیار میں نہیں ہے۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں جس نے قرآنی ترتیب کے انوکھے پن میں غور کیا ہے اور اس کے نظم کی باریکیوں میں تأمل کیا ہے اس پر یہ حقیقت روشن ہوگی کہ قرآن صرف الفاظ کی فصاحت و معانی کی بلندی ہی میں معجزہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنی ترتیب اور آیات کے نظم میں بھی ایک معجزہ ہے۔

کوئی بھی کلام اگر اس طرح کے مختلف اور ایک دوسرے میں باہم پیوست موضوعات پر مشتمل ہو تو اس میں کوئی نظم اور تناسب ممکن نہیں ہے۔ یہ شان صرف کلام الٰہی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معترض جس بات کو عیب سمجھ رہا ہے وہ اعلی درجے کا ہنر ہے۔ جو شخص بھی قرآن کے نزول اور اس کی ترتیب کی تاریخ سے واقف ہے اس کے نزدیک اس کا بلند مرتبت نظم اور تناسب بدیع کسی بھی طرح معجزے سے کم نہیں ہے۔

قرآن ایک دائمی معجزہ:

نزول قرآن سے آج تک عربی زبان نہ جانے کتنے مراحل سے گزر چکی ہے لیکن قرآنی اسلوب ہر دور میں تروتازہ رہا ہے۔ ہر دور میں وہ آسمان بلاغت پر متمکن رہا ہے اور ہر دور کے انسان کو اپنی ہدایت کی روشنی سے منور کرتا رہا ہے۔ اس کا اسلوب آج بھی تروتازہ ہے۔ آج بھی اس کا اسلوب عربی بلاغت کا معیار اور فصاحت کا آئینہ دار ہے۔ اس اسلوب کے خوشہ چین صرف علماء ازہر شریف ہی نہیں بلکہ عربی زبان کے اکلوتے نوبل انعام یافتہ ادیب نجیب محفوظ کی تحریروں میں بھی اس کی تاثیرات نمایاں ہیں۔

قرآن کا اسلوب چودہ سو برس سے پرچم اعجاز کو بلند کئے ہوئے ہے اور آج بھی تمام جن وانس کے لیے اس کا چیلنج برقرار ہے: " قل لئن اجتمعت الانس والجن علی أن یأتوا بمثل هذا القرآن لایأ تون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیراً " (الاسراء:۸۸) یعنی کہہ دیجئے کہ اگر سارے انسان اور جن اس بات پر اکٹھا ہو جائیں کہ وہ قرآن کی مثال لائیں تو بھی وہ نہ لاسکیں گے خواہ ان میں سے بعض بعض کے مددگار کیوں نہ ہو جائیں۔ نہ انفرادی طور پر قرآن کی مثال پیش کی جاسکتی ہے اور نہ اجتماعی طور پر۔

اور تاریخ شاہد ہے کہ کوئی اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ نہ عرب میں فصحاؤ بلغاء کی کمی تھی نہ شعراء وخطباء کی کوئی قلت۔ قرآن کی مثال پیش کر کے بڑی آسانی سے وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اسلام کو روکنے کے لیے تمام راستے اختیار کئے سوائے اس سیدھے اور آسان راستے کے۔ اگر کوئی شدت پیاس سے جاں بلب ہو پانی بھی اس کے قریب ہو لیکن پھر بھی وہ پینے سے اعراض کرے تو اس کے سوا کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ پانی پینے پر قادر نہیں ہے۔

قرآن نے بھی ان کے عجز کو پوری طرح ثابت کرنے کے لیے اپنے چیلنج میں ڈھیل پر ڈھیل دی پہلے پورے قرآن کی مثال لانے کو کہا گیا:" فلیأ توا بحدیث مثله

إن كانوا صادقين" (الطّور:۳۴) یعنی تو لے آئیں اس کے مثال کوئی کلام اگر سچے ہوں۔ پھر چیلنج کو آسان کرتے ہوئے صرف دس الگ الگ سورتوں کی مثال لانے کا مطالبہ کیا گیا: " قل فأتوا بعشر سور مثله مفتريات " اور کہا گیا کہ اللہ کے سوا جسے چاہیں اپنا مددگار بنالیں:"وادعوا من استطعتم من دون الله " (ھود:۱۳-۱۴) جب عرب ایسا کرنے سے بھی عاجز رہ گئے تو چیلنج کو مزید آسان کر دیا گیا۔ اگر یہ سب نہیں کر سکتے تو کسی ایک سورت ہی کی مثال لے آؤ: "إن كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا فاتوا بسورة من مثله واد عوا شهداء كم من دون الله إن كنتم صادقين ، فإن لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التي و قود ها الناس و الحجارة أعدت للكافرين" (البقرہ:۲۳-۲۴) ہم نے اپنے بندے پر جو نازل کیا ہے اگر اس میں تمہیں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ اللہ کے سوا اپنے حامیوں کو بھی بلا لو اگر تم واقعی سچے ہو پس اگر ایسا نہ کر سکے اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ لیکن اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والوں اور اپنے سوا ساری دنیا کو گونگا و بے زبان کہنے والوں سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ وہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت ہی کی مثال پیش کر سکتے۔

چیلنج کے تیسرے مرحلے سے یہ بات بھی مترشح ہے کہ قرآن کی سب سے چھوٹی سورت کی مقدار معجزہ ہے اور اس طرح قرآن صرف مکمل طور پر ہی ایک معجزہ نہیں بلکہ ہزاروں معجزات پر مشتمل ہے لہٰذا جو صرف پورے کلام الٰہی کو معجزہ مانتے ہیں جیسے معتزلہ اور جو قرآن کے ہر جزء کو خواہ ایک سورت سے بھی کم ہو اسے بھی معجزہ مانتے ہیں برسرحق نہیں ہیں۔

معارضۂ قرآن:

باوجودیکہ اساطین فصحائے عرب نے قرآن کے معجزانہ اسلوب و بلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے اور علیٰ رؤس الاشہاد قرآن کا معارضہ کرنے اور اس کی مثال لانے سے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا۔ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضہ ہوا کہ کچھ لوگ ایسی کوشش

کریں تا کہ آسمانی دعوے کو زمینی دلیل مل جائے اور قرآن کی معجزانہ شان اور ظاہر و باہر ہو جائے۔ مسلیمہ کذاب نے دعوی کیا کہ وہ بھی نبی مبعوث ہے اور اس کے پاس بھی قرآن کے مثل وحی آتی ہے اور جو کلام اس نے وحی کے نام پر پیش کیا وہ اس قدر رکیک، سطحی اور پست تھا کہ اس پر ایمان لانے اور اس کی تائید کرنے والے بھی اس سے شرمندہ ہوئے۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱- انا اعطيناك الجماهر، فصل لربك و جاهر۔

۲- والطاحنات طحنا، العاجنات عجنا، والخابزات خبزا۔

بھلا قرآن کی فصاحت اور اس کے معنی کی بلندی سے اس گھٹیا اور بازاری کلام کو کیا نسبت۔ حُجت ادب عربی علامہ رافعی نے اس موضوع پر بڑی ہی جامع گفتگو فرمائی ہے۔ میں اسی کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں فرماتے ہیں: درحقیقت مسلیمہ نے قرآن کے معارضے کا ارادہ ہی نہیں کیا کیونکہ قرآنی اسلوب بیان کی معجزانہ شان اس قدر واضح اور صاف ہے کہ وہ مسلیمہ یا کسی بھی عرب سے مخفی نہیں رہ سکتی اور مسلیمہ لسانی و بیانی صنعت کی حیثیت سے قرآن کا معارضہ کرنے یا اس کی مثال لانے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے تو قرآن کی نقل میں یہ مسجع کلام وضع کرنے کی کوشش اس لیے کی تا کہ وہ اس کے ذریعے اپنی قوم کے دلوں پر قبضہ کر سکے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عرب کاہنوں کی بے حد تعظیم کرتے ہیں اور کاہنوں کا کلام سجع پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس سطحی کلام کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے اس مکر و حیلے میں بھی خاطر خواہ کامیاب نہیں ہوا۔ چنانچہ اس کے اکثر متبعین جانتے تھے کہ وہ جھوٹا اور بے وقوف ہے اور کہا کرتے تھے کہ: " إنه لم يكن في تعاطيه الكهانه حاذقا ولافي دعوى النبوة صادقا، وإنما كان اتباعهم إياه كما قال قائلهم: كذاب ربيعة أحب إلينا من صادق مضر" یعنی مسلیمہ نہ کہانت کو برتنے میں ماہر تھا نہ اپنے دعویٰ نبوت میں سچا تھا اور وہ اس کی پیروی صرف اس مَثَل کے طور پر کرتے تھے جو ان کے کہنے والے نے کہا تھا (یعنی جس پر ان کے قبیلہ جاتی نظام میں عمل ہوتا تھا) کہ ہمارے نزدیک قبیلۂ ربیعہ کا جھوٹا مضر کے سچے سے زیادہ محبوب ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ابوالعلاء معری، ابوطیب متنبّی اور ابن مقفع جیسے فصحاء کو بھی

ان کے نفوس نے قرآن کا معارضہ کرنے پر اکسایا لیکن ان کے ہاتھ ناکامی و ہزیمت کے سوا کچھ نہ لگا۔ ماضی قریب میں بابی، بہائی اور قادیانی فرقوں کے زعماء نے بھی معارضۂ قرآنی کی کوشش کی اور مضحکہ خیزی اور جہالت کے یہ نمونے رہتی دنیا تک انسانیت کو سامان فراہم کرتے رہیں گے۔

اسلوب قرآن اور اسلوب حدیث:

کسی عام انسان کی کیا حقیقت خود افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنھیں ان کے رب نے جوامع الکلم سے نوازا ہے ان کا اپنا کلام بھی قرآن جیسا نہیں ہے اور عربی زبان کا ذوق رکھنے والا جانتا ہے کہ اسلوب قرآن اسلوب حدیث سے مختلف اور بلند تر ہے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی فصاحت وخوبی کے اس بلند مرتبے پر ہے جہاں کسی دوسرے انسان کا کلام نہیں پہنچ سکتا ہے۔ قرآن و حدیث کے اسالیب کا یہی وہ واضح فرق تھا جس کے سبب قریش نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام ہے کیونکہ ان کے نزدیک بھی قرآن کی زبان اور اسلوب اور نبی کریم صلی اللہ وسلم کی زبان اور اسلوب میں فروق و اختلافات واضح تھے۔

اعجاز قرآن اور صرفہ:

صرفہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن فی حد ذاتہ معجزہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا معارضہ کرنے اور اس کی مثل لانے سے ان کے عزائم کو پھیر دیا اور ان کی ہمتوں کو پست کر دیا۔ یہ قول عموماً معتزلہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں اکابرین معتزلہ جیسے ابواسحاق نظام، ہشام قوتی اور عباد بن سلیمان جیسے متقدمین کے کلام کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اور انھوں نے اسی ''صرفہ'' کو قرآن کا بنیادی وجہ اعجاز قرار دیا۔ لیکن بعد کے معتزلیوں نے اس کے ساتھ ساتھ قرآنی اسلوب اور بلاغت کو بھی مستقل وجہ اعجاز مانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن فی نفسہ معجزہ ہے اور صرفہ کا قول باطل محض ہے۔ یہ

قول عقل پسندی کا نتیجہ ہے چونکہ قائلین صرفہ کے نزدیک قرآن عربی زبان کے مفردات وتراکیب سے مرکب ومؤلف ہے لہٰذا فی حد ذاتہ معجزہ نہیں ہوسکتا۔ اگر اس کا معارضہ نہیں کیا گیا تو اس کے دوسرے اسباب ہیں۔ یا تو عربوں نے معارضہ کرنا ہی نہیں چاہا یا پھر صرفہ کے ذریعے اللہ نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

لیکن عقل ومنطق کے نام پر پیش کئے جانے والے یہ اعتراضات خود خلاف عقل ہیں اور تاریخی حقائق سے متصادم بھی ہیں۔ قرآن نے عربوں کو جس انداز میں للکارا ہے شاید بزدل سے بزدل قوم بھی اس کا معارضہ کرنے میں پس وپیش نہ کرتی۔ معارضے کے دواعی واسباب بھی پوری طرح موجود تھے عربوں میں حمیت اور عزت نفس کی بھی کمی نہ تھی۔ قرآن بھی انھیں معارضے کے لیے مسلسل برانگیختہ کررہا تھا اور ان کے فکر وعمل پر مسلسل تنقید کررہا تھا۔ علاوہ ازیں عرب بھی قرآنی پیغام کو روکنے کے لیے ہر ممکن عمل کررہے تھے۔ اور اس ضمن میں اپنے تمام امکانات کو بروئے کار لارہے تھے جن میں اغراء، ایذاء مقاطعہ اور جنگ وجدال سب شامل ہیں۔ تو کیسے ممکن ہے کہ اگر وہ معارضۂ قرآن پر قادر ہوتے تو اسے نظر انداز کردیتے۔ اور ایک بڑی دلیل خود فصحائے عرب کا قرآن کے اسلوب وبیان کی عظمت کا اعتراف ہے۔ اگر قرآن کا معارضہ نہ کرسکنا صرفہ کے سبب ہوتو وہ ساری روایتیں بے معنی ہوجائیں گی جن میں قرآنی بلاغت کے سامنے عرب کے بڑے بڑے خطباء وشعراء کے مبہوت رہ جانے کا ذکر ہے۔

یہ تھے قرآنی اسلوب اور ان کی خصوصیات کے بعض پہلو جنھیں علمائے کرام کی تحریروں سے خوشہ چینی کرکے میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون اس قدر طویل ہونے کے بعد بھی تشنہ ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے اعجاز کا استیعاب واحاطہ انسانی طاقت وسعت سے باہر ہے۔

قل لو كان البحر مدادا لكلمات ربى لنفد البحر قبل أ ن تنفد كلمات ربى ولو جئنا بمثله مد دا (الکھف:۱۰،۹) صدق اللہ العظیم

اس مقالے کے بنیادی مآخذ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- قرآن کریم۔

۲- ابن منظور، لسان العرب، قاھرہ: الدار المصریۃ للتالیف، غیر مورخ۔

۳- فیروز آبادی، القاموس المحیط، بیروت، مؤسۃ الرسالہ، باردوم، ۱۹۸۷ء۔
۴- محمد عبدالعظیم زرقانی، مناھل العرفان، قاہرہ: عیسی بای حلبی، باردوم، ۱۳۷۲ھ۔
۵- باقلانی، اعجاز القرآن، تحقیق: احمد صقر، مصر: ۱۹۵۴ء۔
۶- ابوالحسن الاشعری، مقالات الاسلامیین، قاھرہ: مکتبۃ النہضہ المصریۃ، ۱۹۵۰ء۔
۷- جرجانی، دلائل الاعجاز، قاہرہ: مطبعہ المنار، غیر مورخ۔
۸- یحییٰ بن حمزہ علوی، الطراز فی اسرار البلاغۃ ودلائل لاعجاز، قاہرہ: مطبع المقتطف، ۱۹۱۶۔
۹- رافعی، اعجاز القرآن، مصر: مطبع المقتطف المقطم، ۱۹۲۸ء۔
۱۰- عائشۃ بنت الشاطی، الاعجاز البیانی للقرآن الکریم، اُردو ترجمہ، محمد رضی الاسلام، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، باراول، ۱۹۹۱ء۔
۱۱- حاجی خلیفہ، کشف الظنون، بغداد: مکتبۃ المثنی، غیر مورخ۔
۱۲- سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، قاہرہ: المکتبۃ التجاریۃ، غیر مورخ۔